ڈاکٹر انعام الحق کوثر

ملّی تعمیرِ نو میں تعلیم کا کردار

ملّی تعمیرِ نو میں تعلیم بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ تعلیمی درس گاہیں اور ادارے ہی ترسیلِ علم کا ذریعہ ہیں اور وہی افراد کی ذہنی صلاحیتوں کی نشو و نما اور ان کے کردار کی تعمیر ہوتی ہے، لیکن اصل میں تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے، جس میں معاشرے کے کم و بیش تمام شعبے اور اکائیاں اپنا اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ انسان جب اس دُنیا میں آنکھیں کھولتا اور زندگی کا آغاز کرتا ہے تو اُس کی ذہنی و جسمانی صلاحیتیں خام ہوتی ہیں۔ ان خام صلاحیتوں کو ترقی دینے اور انسانی سیرت و کردار کو اُجالنے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اوّلین اُستاد کے فرائض ماں باپ، بہن، بھائی اور گھر کے افراد انجام دیتے ہیں۔ گو وہ شعوری طور پر چاہیں یا نہ چاہیں بچے اُن سے کچھ نہ کچھ سیکھتے رہتے ہیں۔ گھر کی چار دیواری سے باہر نکلیں تو جہاں بھی نو آموز اور تجربہ کار اکٹھے ہوتے ہیں، تعلیم کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ تعلیمی درس گاہیں تو نئی نسل کی تربیت اور قوم کے مستقبل کی تعمیر کے لیے ہی قائم ہوتی ہیں۔ اِن کے علاوہ معاشرتی تعلقات، باہمی روابط، ذرائع ابلاغ اور معاشرے کے دیگر مؤثرات تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

مناسب ہوگا کہ پہلے تعلیم کے حقیقی مفہوم کی وضاحت کر دی جائے۔ لفظ تعلیم عربی زبان کے لفظ علم سے مشتق ہے، جس کے معنی جاننے یا واقفیت حاصل کرنے کے ہیں۔ علم سے مراد دانائی اور شعور کے علاوہ پختگی اور مضبوطی بھی ہے۔ اس تصریح کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے افراد کو معلومات بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ علم و دانائی کی تربیت بھی دی جاتی ہے، تاکہ اُن کی شخصیت کی تعمیر ہو اور وہ عصری تقاضوں کا ساتھ دینے کے لیے ماحول سے بہتر مطابقت پیدا کر سکیں۔

اسلام اور ہمارے ملّی نقطۂ نظر سے تعلیم کا صحیح عمل وہی ہے جو حیاتِ انسانی کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ہو اور ایک تسلسل کے ساتھ جاری و ساری رہے۔

اطلبوا العلم من المهد الی اللحد (ماں کی گود سے لے کر قبر کی لحد تک علم حاصل کرتے رہو) کے مطابق انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ عمر بھر علم و حکمت کے موتی سمیٹتا رہے تاکہ ذہنی بالیدگی برقرار رہے اور نشوونما کا عمل عمر کے آخری سانسوں تک آگے ہی آگے قدم بڑھاتا رہے۔

تعلیم اور علم کی اہمیت مسلم سوسائٹی میں کس قدر اہم ہے۔ اُس کا اندازہ حضور پاک صلّی اللہ علیہ وسلم کی اُس دُعا سے ہوتا ہے جو ربِ کائنات نے سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلم کو خود سکھائی یعنی "**ربِ زِدنی عِلما**"۔ یہاں اس بات کی وضاحت ایک بار پھر ضروری ہے کہ اسلامی فکر کے مطابق علم سے مراد علمِ نافع ہے۔ اس سلسلے میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی حدیثِ مبارکہ ہے۔

اللھم انی اعوذ بک من علم لا ینفع۔

اے میرے ربّ! مجھے ایسے علم سے محفوظ رکھ جو نفع بخش نہ ہو۔

اسلام نے تعمیرِ ملت اور ملّی تعمیرِ نو کے لیے ترویجِ علم پر بڑا زور دیا ہے، جس کا کچھ اندازہ تو ان احادیث سے ہی ہو جاتا ہے۔ باقی کتابِ مقدس کے تو صفحات کے صفحات علم و حکمت اور اس کی تلقین سے مزیّن ہیں۔

تعلیم کی اس اہمیت و ضرورت کے پیشِ نظر نہ صرف قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں اور عصرِ حاضر کی مہذب اقوام بلکہ قدیم معاشروں نے بھی حالات و ضروریات کے مطابق اپنے یہاں تعلیم کا اہتمام کیا۔

اگر ہم تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو چاہے وہ بابل و نینوا اور نیل کی قدیم تہذیبیں ہوں یا حجری دور کے غیر مہذب معاشرے، یونان کی جمہوری شہری ریاستیں ہوں یا روم کی عظیم سلطنت، ہندوؤں کا برہمی سامراج ہو یا مغرب کا جدید جمہوری نظام، سب کی تعمیر میں تعلیم نے اہم کردار ادا کیا۔ تاریخ کے اُجالے میں ہمیں جو اوّلین نظام ہائے تعلیم نظر آتے ہیں وہ سپارٹا اور ایتھنز کے ہیں۔ اہلِ ایتھنز بچوں کی شخصیت کی متوازن اور مکمل نشوونما کے قائل تھے، جب کہ اہلِ سپارٹا جسمانی تعلیم اور عسکری تربیت پر زور دیتے تھے۔ دونوں شہری ریاستوں کے اپنے اپنے اغراض و مقاصد تھے۔ اہلِ ایتھنز کے سامنے کھُلا سمندر تھا جو اُنھیں روزگار کے مواقع کے ساتھ ساتھ افکارِ تازہ بھی بہم پہنچاتا تھا، جب کہ اہلِ سپارٹا کو اپنے سے دس گنا زاید مغلوب میسنینن (Messenian) کو قابو میں رکھنا تھا۔ دونوں ریاستوں نے اپنے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق اپنے نظام ہائے تعلیم بنائے۔ لیکن اہلِ سپارٹا تے باوجود بہتر جسمانی

تعلیم اور عسکری تربیت کے اہل ایتھنز سے شکست کھائی۔ اہلِ ایتھنز کی برتری دراصل ان کے نظامِ تعلیم کی برتری تھی۔

قریب کے زمانے میں دیکھیے، واٹرلو کی مشہورِ زمانہ لڑائی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ کی بجائے اصل میں ایٹن کے مدرسوں میں لڑی گئی تھی۔

ہم اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ علم و آگہی کا نور ہی تھا کہ بوریا نشینوں اور گلّہ بانوں نے دنیا کی امامت کی۔ جب تک وہ اپنے فکر و نظر کو اس نقطے پر مرکوز کیے رہے دنیا پر چھائے رہے۔ چٹائیوں پر بیٹھ کر ہی علم و حکمت کے لازوال موتی بکھیرتے رہے، اور جب اُن کی نظر اس نقطے سے ہٹ گئی تو اُن کا رشتہ بھی علم و حکمت کے اصل سرچشموں سے کٹ گیا۔ علم و حکمت کے وارث وہی بنتے جن تک وہ پہنچاتے رہے تھے۔ مغرب نے مسلمانوں سے فیض حاصل کیا اور علم و حکمت کی بنیادی فکر کو اپنی ثقافت، اپنی روایات اور اپنے تقاضوں کے مطابق ڈھالا۔ یوں ڈھالا کہ مسلمان اس فکری یلغار کا مقابلہ نہ کر سکے۔ کیونکہ اُن میں علم کی لگن، علم کی پیاس، علم کا شوق، علم کی محبت اور تعمیرِ ملّت کا جذبہ سب سرد ہو چکے تھے۔

مجھے احساس ہے کہ تعلیم کی اہمیت و افادیت اور ملّی تعمیرِ نو کے سلسلے میں تعلیم کے کردار کی وضاحت اس طرح کی مثالوں اور توجیہات سے ممکن نہیں، اس لیے کہ تعلیم کے کئی پہلو بے شمار مضمرات اور ان گنت مؤثرات ہیں۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہالت کی تاریکیاں ہوں یا معاشرتی برائیاں، حالات کی سنگینیاں ہوں یا غربت و افلاس کی پرچھائیاں، تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جو ان زہرناک اندھیروں کو دُور کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی زرنگار شاہراہوں کو وا کر سکتا ہے۔ مہذب اور صالح معاشرے اسی کی بدولت تشکیل پاتے ہیں۔ اس لیے کہ تعلیم افراد کو ملکی، سیاسی اور سماجی ذمے داریوں کا شعور عطا کرتی ہے اور دین و دنیا کے تقاضے پورے کرتی ہے۔ یہی افراد بعد میں ملت کو روشنی عطا کرتے ہیں۔

بلاشبہ تعلیم کے ذریعے افراد تیار کیے جاتے ہیں، لیکن بالآخر یہ تیاری ایک قوم اور ایک ملت کی تیاری اور تعمیرِ نو پر منتج ہوتی ہے۔ ملّی تعمیرِ نو میں تعلیم کے کردار پر بات کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ تعلیم سے متعلق چند ممتاز مفکرین کی آرا بیان کر دی جائیں تاکہ تعلیمی عمل کے دائرۂ کار کی وضاحت بھی ہوتی چلے۔

عظیم مسلم مفکر و دانشور علامہ ابنِ خلدون نے تعلیم کو غور و فکر کا ذریعہ قرار دیا ہے، جس سے انسان

انسان بقائے نسل کے بہتر انتظام کے ساتھ ساتھ عمرانی زندگی کو بھی خوش گوار بناتا ہے۔ علامہ ابن خلدون کی یہ رائے صدیوں سے صائب مانی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عام سوجھ بوجھ حیوانوں میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن تعلیم کے ذریعے جو تدبر و تفکر انسان میں پیدا ہوتا ہے وہ حیوانوں میں نہیں ہوتا۔ حیوان تو اپنے آپ کو محض ماحول کے رحم و کرم پر پاتے ہیں۔ اگر ماحول ساتھ دے تو چلتے پھرتے ہیں اور اگر ماحول ساتھ نہ دے تو نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ لیکن انسان ماحول کے رحم و کرم پر نہیں ہوتا۔ اُسے تو صدیوں پر پھیلی انسانی زندگی کے بیش قیمت تجربات اور اُن کی ہر منطقی وجہ جواز و نہج سے متعلق عقلی و فکری توجیہات تعلیم کی صورت میں میسر ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ اپنے تدبر و تفکر کو کام میں لاتے ہوئے ماحول میں مناسب رد و بدل کر سکتا ہے، یہاں تک کہ اپنے فکر و شعور کی کارکشایانہ مہارت و صلاحیت سے جھلسے ہوئے صحراؤں اور یخ بستہ ویرانوں تک کو سبزہ زاروں اور مرغزاروں میں تبدیل کر سکتا ہے۔ علامہ ابن خلدون کے تجربات کا یہ نچوڑ ملّی تعمیر نو میں تعلیم کے کردار کی کماحقہٗ وضاحت کرتا ہے۔

مشہور مغربی مفکر جان ڈیوی نے علامہ ابن خلدون کی بات کو ہی آگے بڑھایا ہے۔ اُس کے خیال میں جب تک زندگی کی سانسیں چلتی ہیں نشو و نما کا عمل جاری رہتا ہے، اور جب تک یہ نشو و نما جاری رہتی ہے تعلیم کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، یعنی زندگی اور تعلیم لازم و ملزوم ہیں۔ جان ڈیوی تعلیم کو ایسے تجربات کی تعمیر نو کا نام دیتا ہے جو فرد اور سماج دونوں کے لیے مفید ثابت ہوں۔ جدید ماہرین کی سوچ بھی علامہ ابن خلدون اور جان ڈیوی کی سوچوں سے ملتی جلتی ہے۔ وہ تعلیم کو انسانی رویوں میں ایسی تبدیلی بتلاتے ہیں، جس سے افراد جدید تقاضوں کو نبھاتے اور اپنے آپ کو ماحول سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ جدید ماہرینِ تعلیم اسی ہم آہنگی اور مطابقت کے عمل کو تعلیم کا نام دیتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں اسلامی فکر ذرا مختلف ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اُسے یہ برتری خالقِ کائنات نے عطا فرمائی ہے۔ انسان اشیا کی حقیقت اور اصلیت کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اُس میں تلاش و جستجو کے لیے گراں جذبے ہمہ وقت موجزن رہتے ہیں۔ مگر وہ اپنے علم، اپنے تخلیقی، ایجادی اور تعمیری اوصاف کے باوجود خدائے بزرگ و برتر کا محتاج ہے۔ اس لیے کہ خالقِ حقیقی کی ذات ہی علم و آگہی کا سرچشمہ ہے۔ اُسی کی ذات پر تمام تر انسانی علم کا انحصار ہے۔ اگر انسانوں کی روزمرہ کی زندگی کے معمولات، ان کے کردار و اعمال، باہمی مراسم، رویے اور عادات وغیرہ اُس ذاتِ واحد کے تابع ہوں تو علم محض روزی کمانے اور اپنے آپ کو دوسروں سے

بہتر سمجھنے کا ذریعہ نہیں رہتا بلکہ اُس سے خداشناسی پیدا ہوتی ، اخلاقی بے راہ روی اور اخلاقی انحطاط کے امکانات محدود و مسدود ہوتے ہیں اور ملت کی تعمیرِ نو کے امکانات روشن تر !

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بابل و نینوا کی طرح کی قدیم تہذیبیں اور بعد کی عظیم سلطنتیں علم و آگہی میں کمال حاصل کرنے کے باوجود کیوں تباہ ہوئیں ؟ دراصل انسانی معاشرہ بڑی حد تک انسانوں کے باہمی اغراض و مقاصد کی تکمیل سے مشروط ہوتا ہے ۔ کچھ معاشروں میں یہ ہوتا ہے کہ زیادہ باصلاحیت اور سرگرمِ عمل افراد ایسے کلیدی مناصب حاصل کر لیتے ہیں کہ جن کے ذریعے وہ زیادہ سے زیادہ ثمرات سمیٹ لینے اور اُن کے حقدار بن جاتے ہیں ۔ یوں رفتہ رفتہ وہ اکثر و بیشتر کارکشایانہ ذرائع و وسائل پر اپنا تسلّط جما لیتے ہیں ۔ انسانی معاشرے کی یہ ایسی خامی ہے جو اسے بالآخر داخلی تضاد ، اخلاقی انحطاط اور فکری انتشار کی منزل تک لے جاتی ہے ۔

آج کا مغربی معاشرہ بھی کم و بیش انہی بنیادوں پر اُستوار ہے ۔ نتیجتاً اس سے خداشناسی کی بجائے خدافراموشی کو زیادہ تقویت ملتی ہے ۔ مغربی تعلیم اور علوم و تمدن کی بنیاد عقلی استدلال ، مشاہدے اور تجربے کے علاوہ معرفتِ الٰہی اور عرفانِ نفس سے بھی علم حاصل کرتا ہے جو زیادہ قابلِ فخر اور زیادہ قیمتی ہوتا ہے ۔ اسلام تو ملی تعمیرِ نو کی بنیاد ہی وحیِ الٰہی اور ہدایتِ الٰہی پر رکھتا ہے اور اسی بنیاد پر ملّتِ اسلامیہ کی تعمیر کرنا چاہتا ہے ۔ حقیقتاً تعلیم کا حقیقی مفہوم بھی یہی ہے ۔

ان حقائق کی روشنی میں جب ہم تعلیم اور تہذیب و تمدن کے مضمرات پر غور کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ چونکہ ملّتِ اسلامیہ کا ہر فرد اپنے ہر عمل کے لیے خدائے بزرگ و برتر کی خوشنودی اور رضاجوئی کا متمنی ہوتا اور اپنے ہر عمل کے لیے اُسی کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے ، اس لیے اُس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرہ ان اسباب و علل اور عوامل سے پاک ہو جاتا ہے ، جن کے باعث انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال ہوتا ہے اور معاشرے میں تضاد ، انتشار اور انحطاط جیسی کھائیاں پیدا ہوتی ہیں ۔

اگر ملّتِ اسلامیہ کے افراد اسلام کی اس حقیقی روح میں مخلص ہوں ، اور اُن کے نظامِ تعلیم میں یہ فکر رچی بسی ہو تو تعمیرِ نو کا کام اتنا دشوار بھی نہیں ۔ مولانا جلال الدین رُومی نے اپنے احتساب ، دروں خوانی اور چہرے کا نقاب دُور کرنے کی تلقین کے ساتھ ساتھ "مردِ خدا" کی تعریف کچھ یوں کی ہے کہ "وہ گودڑی میں شاد ،

ویرانے میں خزینہ، بحرِ بے کنار، بے حساب موتی برسانے والا اور اللہ کا عالم ہوتا ہے۔" مولانا رومی مردِ خدا کا کردار بیان کرنے کے لیے اپنی کتاب فیہ ما فیہ میں لکھتے ہیں :

" ہم سمرقند میں تھے کہ خوارزم شاہ نے سمرقند کا محاصرہ کر کے اُس پر چڑھائی کی اور جنگ شروع کر دی۔ اس علاقے میں ایک عظیم صاحبِ کمال لڑکی تھی، اس طرح کی کہ شہر میں اُس کی مثال نہ تھی۔ ہر لحظہ میں نے اُسے یہ کہتے سُنا۔" خداوندا۔! مجھے ظالموں کے ہاتھ میں دینا تجھے کیسے گوارا ہوگا، جب کہ مجھے یہ معلوم ہے کہ تجھے یہ پسند نہیں اور مجھے تنہا تم پر کامل اعتماد ہے۔" جب شہر غارت ہو گیا اور وہ لوگ قیدی بنا لیے گئے، انہی قیدیوں میں وہ لڑکی بھی شامل تھی، لیکن اُسے کوئی گزند نہ پہنچا اور اُس کے صاحبِ جمال ہونے کے باوجود اُس پر کسی کی نظر ہی نہ پڑی۔"

اس پر مولانا رومی یوں نتیجہ نکالتے ہیں :" پس جان لے کہ جس نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا وہ آفتوں سے مامون ہو گیا اور بسلامت رہا اور اللہ کے حضور اُس کی درخواست ضائع نہ گئی۔"

اپنے دعوے کی دلیل میں مولانا رومی ایک اور مثال اس طرح دیتے ہیں : ایک درویش نے اپنے بچے کو تربیت دی تھی کہ ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لیے خدا سے التجا کرنا چاہیے۔ جب وہ روتا اور خدا سے کوئی چیز مانگتا تو اُسی وقت وہ چیز حاضر کر دی جاتی۔ یہاں تک کہ اس معمول پر کئی سال گزر گئے۔ ایک دن بچہ تنہا گھر میں رہ گیا اور اُسے ہریسہ (ایک قسم کا کھانا جو گیہوں کے آٹے، گوشت کی یخنی اور دودھ سے پکاتے ہیں) کی ضرورت ہوئی۔ اُس نے عادت کے مطابق خدا سے التجا کی اور فوراً ہریسہ کا ایک پیالہ غیب سے آ گیا۔ بچے نے جی بھر کر کھایا۔ جب ماں باپ واپس آئے تو اُنھوں نے پوچھا، کسی چیز کی ضرورت ہے۔ بچے نے جواب دیا، ابھی ابھی ہریسہ کی ضرورت پڑی تھی، میں نے التجا کی اور کھا لیا۔ اُس کے باپ نے کہا : الحمد للہ کہ تم اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں اللہ تعالٰی پر تمھارا اعتماد و وثوق پوری طرح بحال ہو گیا۔

مولانا رومی کی ساری تعلیم کی بنیاد یہ ہے کہ احکامِ خداوندی اور ارشاداتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی کرنے سے ہی دُنیا اور آخرت کی فلاح نصیب ہوتی ہے، یہی اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

یہ کوئی خیالی، تخیلاتی اور کتابی بات نہیں، بلکہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب بھی ملتِ اسلامیہ کے افراد نے اسلام کی حقیقی روح اور بنیادی فکر کو اپنے سینوں میں بسایا، علم و حکمت کے چراغ روشن ہوئے۔ بڑے بڑے فلسفی، سائنسدان، مفکر اور دانشور پیدا ہوئے، جنھوں نے دُنیا کو علم و آگہی کے نور

سے منوّر کیا ۔ مغربی ممالک تو اُس وقت وحشت میں ڈوبے ہوئے تھے جب ملّتِ اسلامیہ علم کے نور سے جگمگا رہی تھی ۔ بلاشبہ ملتِ اسلامیہ نے دُنیا کے علمی خزانے سمیٹے ، لیکن ساتھ ہی جدید سائنسی علوم کی بنیاد بھی رکھی ۔ بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلامی دُنیا نے ہی مغرب کے لیے تحریک احیائے تمدن کی راہیں ہموار کیں ۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب مسلمان قوم تعلیم کی حقیقی روح کا ادراک رکھتی تھی ، مگر جب ان گلّہ بانوں کے پاس یہ فکر نہ رہی تب دُنیا کی امامت مغرب کے حصّے میں آئی ۔ یہ قانونِ قدرت ہے جو قومیں اپنے اصل نصب العین سے رُوگردانی کرتی ہیں ، آپس کی پھوٹ اور اختلاف کا شکار ہو جاتی ہیں تو زوال اُن کا مقدر بن جاتا ہے ۔

آج تعلیم سے متعلق مغربی فکر بالکل اُسی طرح ہمارے نظامِ تعلیم پر چھائی ہوئی ہے جس طرح پندرھویں صدی سے پہلے ہمارا علمی و فنی ارتقا پورے مغرب پر محیط تھا ۔ اس انقلاب کی داستان طویل ہے ۔ مختصراً یُوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب مغربی قوتوں نے مسلم ممالک پر قبضہ جمایا تو عمداً یہاں اپنی تہذیب و تمدن پر مبنی نظامِ تعلیم مسلط کیا جو اپنی فکر اور اپنے فکری مواد کے ساتھ آج بھی ہمارے نظامِ تعلیم پر کسی نہ کسی صورت چھایا ہوا ہے اور ہم میں بے عملی اور بے حسی کی کیفیات ایک تسلسل سے قائم رکھے ہوئے ہے ۔ بہر حال ناامیدی کی بھی کوئی ایسی بات نہیں ۔ اپنی تمام تر ناکامیوں اور ساری کوتاہیوں کے باوجود ملت اسلامیہ اب بھی ایک عظیم مذہبی و معاشرتی حقیقت ہے ۔ اس کے پاس کرۂ ارض کا بہترین ضابطۂ اخلاق موجود ہے اور خوش آئند پہلو یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں علمی و فکری احیا ، نشأۃِ ثانیہ اور بیداری کے آثار نمایاں طور پر دیکھنے میں آ رہے ہیں ۔

یہاں اس امر کی نشان دہی بھی ضروری ہے کہ محض تعلیمی اداروں کے ذریعے دی جانے والی تعلیم تعمیرِ ملّت کے سلسلے میں کوئی قابلِ قدر تبدیلی نہیں لا سکتی ۔ ایسی توقع رکھنا خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں ۔ تعمیرِ ملت اور اصلاحِ احوال کے لیے تو زندگی کے سبھی شعبوں کو مجتمع ہو کر سعی و کوشش کرنا پڑتی ہے ۔ بلاشبہ تعلیمی درس گاہیں افراد کے کردار و سیرت پر اثر انداز ہو کر اُن کی عادات ، اطوار ، خیالات ، رجحانات اور رویوں میں مستقل قسم کی تبدیلیاں لا سکتی ہیں ، لیکن اس کے باوجود یہ تنہا ملی سطح پر تبدیلی کا موجب نہیں بن سکتیں ۔ درحقیقت ہر معاشرے کے اپنے تقاضے ، اپنی اقدار اور اپنے افکار و نظریات ہوتے ہیں جو تعلیم کی اساس کا کام دیتے ہیں ، اسے ہم ملی یا قومی نظامِ فکر کہہ سکتے ہیں ۔ اس نظام کا اپنا مزاج ، اپنی خصوصیات اور اپنے عناصر

ترکیبی ہوتے ہیں جو صدیوں کے عمل سے استحکام حاصل کرتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس نظامِ فکر کو لازمی طور پر افرادِ ملّت کی بھرپور تائید حاصل ہونی چاہیے۔ زبانی جمع خرچ یا آلۂ کار کی بجائے اِسے قوّتِ محرکہ کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے اور یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیمی زندگی اور قومی و ملّی زندگی میں کوئی بڑا بُعد نہ ہو، ورنہ اس سے صرف اور صرف داخلی تضاد ہی اُبھرتا ہے۔ ملّی تعمیرِ نو کا اولین تقاضا یہ ہے کہ قومی زندگی کے مختلف شعبے یعنی سیاست، معاشرت، معیشت اور تعلیم وغیرہ نہ صرف ملّی نظریاتی اساس سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں بلکہ تعلیمی نظام سے بھی ہر لحاظ سے مربوط اور منسلک ہوں۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہو تو تعلیمی درس گاہیں اور مراکز تعمیر کی بجائے تضاد و انتشار کے در وا کرتے ہیں۔

قومی و ملّی تعمیرِ نو کے اہم تقاضے تو یہ ہیں کہ قومی سطح پر مقاصد کے سلسلے میں کوئی تصادم اور ابہام نہ ہو، نظریاتی لگن کو فوقیت اور اوّلیت حاصل ہو، قومی سیاست کے فکر و عمل میں دورُخہ پن نہ ہو، تعلیمی قیادت تعمیری طرزِ فکر رکھتی ہو، نئے تعلیمی تجربات اور نئے دریافت شدہ حقائق سے پوری طرح آگاہ ہو، حُبِ قوم اور حُبِ وطن سے سرشار ہو تاکہ نئی نسل کے لیے نظریاتی حرارت اور رحمت کا باعث بن سکے۔ تعلیمی ماحول خوش گوار اور نظم و ضبط سے آراستہ ہو تاکہ تحقیق و تخلیق کی حوصلہ افزائی ممکن ہو۔ نصاب قومی اُمنگوں اور تقاضوں سے ہم آہنگ اور جدید خطوط پر استوار ہو تاکہ تلاش و جستجو کے جذبات اُبھارے جاسکیں۔ سبھی منازلِ تعلیم میں ایک ربط، ہم آہنگی اور مناسب توازن ہو تاکہ نئی نسل کے لیے مربوط قسم کی متوازن نشو و ارتقا ممکن ہو جائے۔

مختصراً تعمیرِ نو کا پہلا قدم ہی ایک متغیرہ تعلیم ہے اور متغیرہ تعلیم تعمیرِ نو کی ابتدا، رفتار اور منزل رسی کے لیے مندرجہ ذیل کردار ادا کرسکتی ہے۔

۱۔ ڈراپ آؤٹ (ترکِ تعلیم) کی شرح میں کمی اور شرحِ داخلہ و خواندگی میں اضافہ۔
۲۔ تعمیری شعور کی پرورش و افزائش۔
۳۔ مطلوبہ کارکنوں اور ماہرین کی فراہمی۔
۴۔ قومی حِس و کردار کی تشکیل و تصمیم۔